

بحث و نظر:

حضرت مولانا یحییٰ نعمانی

صدر المعهد العالی للدراسات الاسلامیہ لکھنؤ

خصوصی مضمون برائے ”الحق“

علت القتال کیا ہے؟ کفر؟ شوکت کفر؟ یا مجاہدہ؟

جہاد کی آیات اور ان کے پس منظر کی روشنی میں

تمہید و خلاصہ:

اس مضمون میں قرآن و سنت و سیرت نبوی کی بنیاد پر یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ ”فتنہ اور ظلم کے علاوہ“ مجاہدہ علت القتال ہے۔ اسلام نے (بشرط قدرت) دفاعی جنگ کا بھی حکم دیا ہے اور اقدامی کا بھی۔ لیکن با معنی صلح کی خواہش مند غیر مسلم ریاست سے جنگ کی اجازت نہیں ہے۔ مقالہ نگار کے نزدیک جہاد کی یہ تعبیر و تشریح کہ مسلمانوں کو مشرق و مغرب کے ہر کالے اور گورے غیر مسلم ملک پر، چاہے وہ جنگجو ہو یا صلح جو، جنگ کرنے کا حکم ہے، اسلام دشمن لابیوں کی خدمت انجام دینا ہے کہ وہ ساری دنیا کو مسلمانوں کی دشمنی پر متحد کریں۔

مقالہ کا ایک خاص محرک حالات کا ایک نیا لیکن فوری تقاضہ بھی ہے جس کی وضاحت مقالے کے بالکل آخر میں کی گئی ہے۔ اجمالاً وہ ضرورت یہ ہے کہ ہم اب ایک ایسے دور کی دہلیز پر ہیں جس میں دنیا کی قیادت مغرب سے مشرق کی نئی قوموں کو منتقل ہو رہی ہے۔ مستقبل میں یقیناً بین الاقوامی پالیسیوں کا محور نئے مسائل و مصالح اور نئے افکار ہوں گے۔ لہذا فوری ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے بارے میں ”خطرہ“ کے اس تاثر کو ختم کرنے کی کوشش کریں جو اس وقت موجود ہے اور مسلم دشمن لابیوں کے نہایت کام کی چیز ہے۔

اسلامی جہاد کے بارے میں سب سے بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا اس کا مطلب مسلمانوں کو ہر غیر مسلم حکومت سے جنگ کی تعلیم و ترغیب ہے؟ یعنی کیا مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر ان کے لئے ممکن ہو تو وہ ضرور غیر مسلموں سے جنگ کریں۔ اصولی طور پر سوال یہ ہے کہ کیا ظلم و جارحیت اور ”فتنہ“ یعنی مذہبی جبر کے خاتمہ کے علاوہ ”کفر“ علت القتال ہو سکتا ہے؟ یا اگر کفر نہیں تو کیا صرف غیر مسلم حکومت کے وجود کو جنگ کیلئے کافی جواز اور سبب قرار دیا جاسکتا ہے؟۔

ہمارے محدود مطالعے کی حد تک قدیم علمی و فقہی سرمایے میں اس طرح اصولی سوال قائم کر کے مسئلہ پر گفتگو نہیں

کی گئی ہے۔ لیکن اجمالی طور پر مباحثہ اس سے استفادہ کرنے والوں کے لئے درج ذیل ہے۔

(۱) علت القتال کفر ہے۔ اس کی دلیل ﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ﴾ سورۃ انفال: ۳۹۔ (ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ ”فتنہ“ نہ بچے اور دین سب کا سب اللہ کے لیے خالص ہو جائے۔) واضح رہے کہ ہماری کتب تفسیر میں فتنہ کی تفسیر شرک سے بھی کیے جانے کی روایت موجود ہے۔ اور **وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ** تو ظاہر ہے ہی۔

(۲) علت القتال کفر نہیں ہے بلکہ کفر کی حکومت ہے۔ اس رائے کے حاملین کی اصل دلیل مندرجہ بالا آیت ہی ہے، یہ حضرات اس میں دین کو اطاعت اور قانون کے معنی میں لیتے ہیں۔

(۳) علت القتال دفاع ہے، یہ حضرات قرآن کی آیت ﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا﴾ اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو ان سے جو تم سے جنگ کریں اور زیادتی نہ کرنا۔ البقرہ۔ سے استدلال کرتے ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ تینوں ہی موقف اشکالات سے خالی نہیں ہیں۔

دو ضروری باتیں جن سے ان آیات کے صحیح فہم میں مدد ملتی ہے:

(۱) ان اشکالات کے حل کے لیے قرآن مجید کی ان آیات کے گہرے مطالعے اور تدبر کی ضرورت ہے جو جہاد سے متعلق نازل ہوئیں۔ ان کے سلسلے میں یہ اہم بات بطور اصول جان لینا بہت ضروری ہے کہ قرآن میں آیات جہاد کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو مسلمانوں پر جہاد کے فرض قرار پانے کے بعد سابق میں دیے ہوئے حکم کی تاکید، وضاحت یا تحریض و ترغیب کے لیے آئی ہیں، ان کا مقصد نئے احکام دینا نہیں تھا، بلکہ ان کو جنگ پر ابھارنا اور سستی و بزدلی سے بچا کر دشمن کے خلاف جوش جنگ پیدا کرنا تھا۔ لہذا یہ آیتیں قانون جہاد کا بیان نہیں بلکہ تحریض اور ترغیب کی آیات ہیں۔ اور اہل علم واقف ہیں کہ قانونی اور رزمیہ زبانوں میں بڑا فرق ہوا کرتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح نصوص اور خصوصاً حدیث کے نصوص میں ترغیب اور جر و توہین کے لیے جو زبان اور اسلوب استعمال کیا جاتا ہے اس کو خالص اور ٹھیکہ قانونی معنی میں سمجھنے کے بجائے ترغیب و تحریض اور جر و توہین کے فطری اسلوب کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اس کم علم کو ایک لمبے غور و فکر کے بعد پورا اطمینان ہو گیا ہے کہ اس اصول کو مد نظر رکھا جائے تو بہت سے اشکالات اور تضاد کی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔

(۲) اسی طرح قرآنی آیات کا مدعا اور ان میں دیے گئے احکام کی اصل نوعیت سمجھنے کے لئے ان کے پس منظر اور ان حالات کو جاننا بھی ضروری ہے جن کے درمیان وہ نازل ہوئیں۔ کسی کلام کو اگر اس کے پس منظر سے کاٹ دیا جائے یا ان حالات کو نظر انداز کر دیا جائے جن میں وہ صادر ہوا ہے تو کچھ کا کچھ مطلب ہو جانا عین ممکن ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید کے سلسلے میں اس اصول کو مد نظر رکھنا اس لیے مزید ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ کسی تحریر کردہ کتاب کی طرح لکھا نہیں گیا کہ مصنف اس کے سیاق و سباق کو ذہن میں رکھتے ہوئے مرتب بات کرتا ہے اور قیود و شروط اور

وضاحتیں کیجا لکھتا جاتا ہے۔ اور نہ وہ قانون کی کسی کتاب کی طرح دفعات کی زبان میں نازل نہیں ہوا ہے۔ اس کا نزول تو حالات اور واقعات کے ساتھ ساتھ اس طرح ہوتا تھا کہ جب جس رہنمائی، ترغیب و تحریض، ترہیب یا زجر و تنبیہ کی ضرورت پڑی وہ آگئی۔ اس کے صحیح فہم کے لئے ضروری ہے کہ ان واقعات کی کھوج کی جائے جن میں کوئی خاص مجموعہ آیات نازل ہوا تھا اور ذہن و تصور کو اس ماحول میں پہنچانے کی پوری کوشش کی جائے۔

جہاد کے سلسلے میں یہ بات یقینی طور پر سامنے آتی ہے کہ سلف و خلف کے یہاں بڑی حد تک عام تصور یہی ہے کہ مسلمانوں کی حکومت غیر مسلموں سے صلح صرف مجبوری کی حالت میں (یعنی مقابلہ سے عاجزی، یا ایسی صورت میں جب کہ مسلمانوں کی مصلحت کا تقاضا ہو تو) ہی کر سکتی ہے۔ مثلاً فقہ حنفی کی اہم کتاب ”بدائع الصنائع“ میں ہے کہ: صلح کے جائز ہونے کی شرط ضرورت ہے، یعنی یہ کہ مسلمان اس لئے صلح کریں کہ جنگ کی تیاری کریں گے، اور یہ ایسی صورت میں ہی ہو سکتا ہے کہ مسلمان کمزور ہوں اور کفار کو قوت حاصل ہو، لہذا بغیر اضطراب کے صلح جائز نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ صلح کا نتیجہ فریضہ جنگ کا ترک ہے۔ اس لئے یہ اس وقت ہی جائز ہوگی جب یہ جنگ کے وسیلہ کے طور پر ہو، اس لئے کہ ایسی صورت میں صلح درحقیقت جنگ ہی مانی جائے گی کہ وہ جنگ کی تیاری کے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلَامِ وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ﴾ (یعنی کمزوری مت دکھاؤ کہ صلح کی دہائی دینے لگو، اور تم ہی برتر ہو گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے) ہاں مجبوری میں کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے ﴿وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلَامِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ (یعنی، اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو جانا، اور اللہ پر بھروسہ کرنا)

(نیز ملاحظہ ہو: الام، باب المهادنة، شرح السیر الکبیر، باب الموادعة)۔

بعض فقہاء نے صلح کے جواز کے لئے اضطراب اور مجبوری کی سخت شرط نہ لگاتے ہوئے ذرا نرم لفظ مصلحت یا مسلمانوں کے مفاد کا خیال (النظر للمسلمین) جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: الام للشافعی، کتاب الجہاد، باب المهادنة علی النظر للمسلمین۔ نیز شرح السیر الکبیر للسرخسی)۔

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ علماء نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ: فماذا لم یکن فی الموادعة مصلحة فلا یجوز بالإجماع۔ (شرح فتح القدیر، کتاب السیر، باب الموادعة)

(اگر صلح میں مسلمانوں کی مصلحت نہ ہو تو بالاجماع ناجائز ہے)

تقریباً تمام ہی مسالک کی کتابوں میں اس قسم کی تصریحات ملتی ہیں۔ بلکہ یہ مزید وضاحت بھی فقہاء کرتے ہیں کہ اگر دوسرا ملک صلح کی پیشکش بھی کرے تو حاکم دیکھے گا اگر مسلمانوں کی مصلحت ہوگی تو قبول کر سکتا ہے اور اگر مسلمانوں کا فائدہ نہ ہو تو قبول نہیں کرے گا۔ (الام: باب مهادنة من یقوی علی قتاله، المبسوط باب صلح الملوك والموادعة)

بہر حال اس سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ عموماً علماء و فقہاء کے نزدیک قتال کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ مخالف کی طرف سے جارحیت و ظلم یا مذہبی جبر (جسے قرآن نے فتنہ کہا ہے) پایا جائے۔ بلکہ مقدور ہو اور کوئی نقصان یا مضرت نہ ہو تو ہر غیر مسلم حکومت سے جنگ ہی کی جائے گی۔

علت القتال کیا ہے؟ اب اس پر سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ جنگ جو اصلاً خونریزی ہے اور قرآن اس کو شرعی کہتا ہے، کہیں اس کو ”الْبأساء“ (خرابی) کا نام دیتا ہے اور کہیں اس کو شرمانے ہوئے بڑے شر یعنی ظالمانہ مذہبی جبر کے لئے ایک ناگزیر اقدام بتاتا ہے، ایسی صورت میں اس جنگ کا سبب اور علت کیا ہے؟ کیا صرف کفر ہے؟ یا کفر تو نہیں بلکہ ”شوکت کفر“ یا غیر اسلامی حکومت ہے؟۔

اگرچہ فقہاء امت کی تصریحات کے تجزیے سے یہ بات تو غلط ہی ثابت ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک قتال کی علت کفر ہے۔ لیکن اس کے باوجود علماء کے یہاں استثنائی طعہ پر اس قسم کی عبارتیں ملتی ہیں کہ قتال کی علت کفر ہے۔ مثلاً امام قرطبی سورہ بقرہ کی آیت ۱۹۳ ﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ”یہ مطلقاً قتال کا حکم ہے۔ اس میں کفار کے حملہ میں ابتداء کرنے کی شرط نہیں ہے۔ اس کی دلیل ﴿وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ﴾ (یہاں تک کہ دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے) ہے، اور یہ حدیث بھی کہ ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ ”لا إله إلا الله“ پڑھ لیں۔“ اس آیت اور حدیث میں اس کی دلیل ہے کہ قتال کا سبب کفر ہے۔“

البتہ یہ اصول جمہور علماء و فقہاء کے قول سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک اگر غیر مسلم اپنے کفر پر باقی رہتے ہوئے مسلم حکومت کے تابع ہو کر جزیہ کی ادائیگی پر صلح کر لیں تو یہ معاہدہ قبول کرنا لازم ہوگا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے ”کفر“ بطور ایک نظریہ و مذہب دنیا میں قابل برداشت چیز ہے، اور اس کا خاتمہ جنگ کی غایت نہیں۔ اگر قتال کی علت کفر ہوتی تو اس وقت تک جنگ جاری رہنی چاہئے جب تک تمام کفار مسلمان ہو جائیں، اور یہ جائز نہ ہوتا کہ جزیہ پر صلح کر لی جائے۔ یہاں تک کہ ہتھیار ڈالنے والوں کے لئے بھی بس دوسری راہیں ہوتیں: یا اسلام قبول کریں یا قتل کیے جائیں۔ اس طرح یہ نظریہ قرآن کے بیان کردہ بنیادی اصول ﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾ (دین میں کوئی زبردستی نہیں) کے صریح منافی قرار پاتا ہے۔ لہذا اگر یہ کہا جائے کہ نفس کفر جنگ کا سبب یا علت قتال ہے تو کفر تو جنگ کے خاتمے کے بعد بھی باقی رہتا ہے، اس کا خاتمہ تو جنگ کے بعد بھی نہیں ہوتا۔

اس تجزیاتی غور و فکر کے بعد حقیقت میں فقہاء و علماء کے نقطہ نظر کے اصول کے طور پر ہمارے سامنے یہ نظریہ آتا ہے کہ قتال کی اصل علت شوکت کفر یا غیر مسلم حکومت کا وجود ہے۔ اس نظریے کی رو سے کفر جنگ کا سبب نہیں ہے۔ غیر مسلم بطور مسلم ریاست کے شہری (ذمی) کے اپنے کفر پر باقی رہ سکتے ہیں ہاں اگر مسلمانوں کو قدرت ہوگی تو وہ جنگ کر کے غیر مسلموں کی حکومت کو بے دخل کر کے عوام پر اسلام اور مسلمانوں کی حکومت کو قائم کریں گے۔

(ہم آگے اس موقف کی مدلل حمایت کر کے اپنا یہ نقطہ نظر ظاہر کریں گے کہ یہ (اپنے زمانے اور ماحول میں) ایک بالکل برحق اور منصفانہ موقف تھا)۔

سب سے اہم سوال: مگر یہاں سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ کسی غیر مسلم قوم کو کس جواز کی بنا پر اپنے اس حق سے محروم کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے اوپر اپنے لوگوں کی اور اپنے پسندیدہ اصولوں اور نظریات کے مطابق حکومت قائم کرے؟؟؟ اس سوال کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ عام انسانی اخلاقی حس کے مطابق یہ موقف ایک اشکال کا باعث بنتا ہے کہ مسلم ریاست صلح صرف اپنی مصلحت اور ضرورت کے تحت ہی کر سکتی ہے، قدرت و طاقت ہو تو اس کو ہر مملکت سے جنگ ہی کرنی ہے چاہے وہ کیسی ہی بے ضرر اور صلح جو ہی کیوں نہ ہو۔

مولانا مودودی کا نظریہ: اب سے دو صدیوں پہلے جب مغرب کی فوجی یورش کے پہلو میں مسلمان اور اسلامی عقائد و احکام بھی فکری یلغار کا نشانہ بنے تو جو دلیر اسلام کے دفاع کیلئے سب سے پہلے کھل کر سامنے آئے ان میں شبلی و مودودی کا نام نمایاں ہے۔ مؤرخ الذکر کی کتاب اپنی شہرت اور اپنے پر اعتماد انداز کے اعتبار سے ممتاز ہے اور مصنف کی محنت اور مآخذ کی کثرت کی شاہد بھی۔ لیکن کتاب میں آبشار کا جوش اور فکر و خیال کی روانی تو ہے مگر فاضل مصنف اس وقت نہایت کم عمر بھی تھا اور اسکو کتاب ہفتہ وار اخبار (الجمعیۃ) کی متواتر قسطوں میں پیش کرنی تھی، اسلئے اسکے پاس غور و تدبر کیلئے وقت بھی کم تھا۔

موصوف کے سامنے جب یہ سوال آیا کہ ایک طرف تو قرآن مذہب کے معاملے میں جبر واکراہ کی کھلی نفی کرتا ہے تو پھر اس کی کیا توجیہ کی جائے کہ صدیوں پر مشتمل اسلامی فکر کا حاصل یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو مسلمان ریاست جنگ ہی کرے گی، صلح صرف مصلحت ہی کی جائیگی۔ موصوف کی عبقری ذہانت نے اسکا جو حل دریافت کیا وہ بہت سے لوگوں کے لیے اسلامی فلسفہ بن چکا ہے۔ مولانا مرحوم کی بحث کا حاصل یہ ہے کہ اسلام انفرادی طور پر ہر فرد و بشر کو مذہبی آزادی تو دیتا ہے، لیکن وہ اسلام کے مخالف عقیدہ و فکر کو حکومتی طاقت اور شوکت رکھنے کی اجازت نہیں دیتا، اسلئے کہ (انکے بیان کے مطابق) قرآن میں جن چیزوں کو فتنہ اور فساد کہا گیا اور جنکے خاتمے کو جہاد و قتال کا مقصد اور غرض و غایت بتلایا گیا ہے وہ ”سب کی سب ایک ناحق شناس، ناخدا ترس اور بد اصل نظام حکومت سے پیدا ہوتی ہیں“ (الجبہاد فی الاسلام ص ۱۷۱)۔

عالم عرب میں مولانا کے ایک خاص خوشہ چیں انقلابی مفکر سید قطب ہوئے، جو اپنے انقلابی فکر اور جوش تحریر میں مولانا مودودی سے کہیں آگے تھے۔ مصر میں ناصر کے آمرانہ استبداد کے زمانے میں جب عموماً اسلام پسند حکومت کی مغرب پرستی سے سخت نالاں تھے اور دین دشمن حکمرانوں کی مخالفت کی پاداش میں اخوان پر سخت مظالم کا سلسلہ جاری تھا، سید قطب کا شعلہ بار قلم (جس کے جوش و زور کی کوئی نظیر معاصر عربی ادب میں نہیں پائی جاتی) اسلامی انقلاب کی ندا لگا رہا تھا۔ سید قطب نے مولانا مودودی کے دیگر تحریری نظریات کی طرح اس فلسفے کو بھی اخذ کیا اور اپنی تفسیر میں اور (دیگر تعنیفات میں بھی) مولانا مودودی سے کہیں زیادہ قوت اور تفصیل و تکرار سے بیان کیا۔ یہاں تک کہ یہ ایک حد تک

مقبول نظریہ بن گیا۔

مولانا نے بھی فقہاء کی بیان کردہ تفصیلات کا خلاصہ اور حاصل یہی اخذ کیا کہ مسلمانوں کے لئے یہ بات شرعی فریضہ کا درجہ رکھتی ہے کہ اگر حالات اجازت دیں تو وہ ہر غیر مسلم قوم سے حکومت چھین لیں اور ان پر مسلمانوں کی (بلکہ مولانا کے الفاظ میں اللہ کے صالح بندوں کی) حکومت قائم کریں۔

یہ کم علم اپنی کم علمی کے احساس کے باوجود پورے یقین کے ساتھ عرض کرتا ہے کہ اس موقف کی کیسی ہی مؤثر ترجمانی کی جائے مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ (کم سے کم اس زمانے میں) یہ اشکال کا باعث ہے۔ اگر کوئی حکومت نہ اپنے عوام پر کسی سخت ظلم کی مرتکب ہے اور نہ دوسری قوموں پر کسی جارحیت کی مجرم، ساتھ ہی وہ اپنے یہاں بسنے والے مسلمانوں کو اللہ کے دین پر چلنے کی مکمل اجازت دیتی ہے، اور اللہ کے دین کی دعوت کے سامنے رکاوٹ بھی نہیں بنتی اور مسلمانوں کی حکومت کی طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بھی بڑھاتی ہے تو کس اخلاقی جواز کے تحت اس حکومت پر جنگ تھوپی جاسکتی ہے۔ اور کیسے کسی قوم کو اس فطری حق سے محروم رکھا جاسکتا ہے کہ اس کا سیاسی نظام اس کے اپنے لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔ کسی قوم سے خود مختاری سلب کر لینا انسانی عرف میں یقیناً ظلم ہے۔

مولانا مودودیؒ اس اشکال کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ انہوں نے وکیل کی حیثیت سے اپنے موقف کے دفاع میں یہ نظریہ پیش کیا کہ قرآن نے فتنہ کے خاتمہ کو قتال کا مقصد کہا ہے۔ اب ایک نظر ڈالی جائے کہ قرآن میں کن کن برائیوں کو ”فتنہ“ یا ”فساد“ کہا گیا ہے۔ ان برائیوں اور خرابیوں کو گننانے کے بعد مولانا فرماتے ہیں:

”اب اگر ان تمام برائیوں پر ایک غائر نظر ڈالی جائے جن کو فتنہ و فساد سے تعبیر کیا گیا ہے تو اس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ سب کی سب ایک ناحق شناس، ناخدا ترس، اور بد اصل نظام حکومت سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر کسی برائی کی پیدائش میں ایسی حکومت کا براہ راست کوئی اثر نہیں ہوتا تو کم از کم اس کا باقی رہنا اور اصلاح کے اثر سے محفوظ ہونا تو یقیناً اسی حکومت کے باطل پرور اثرات کا رہین منت ہوتا ہے۔“ (الجهاد فی الاسلام ص: ۱۱۷)

اسی وجہ سے مولانا کے بقول اسلام نے بدی کے خاتمے کے لئے حکم دیا کہ ایک منظم جدوجہد (جہاد) کے ذریعہ اور اگر ضرورت پڑے اور ممکن ہو تو جنگ کر کے ایسی تمام حکومتوں کو مٹا دیا جائے۔ اور اسکی جگہ وہ عادلانہ نظام حکومت قائم کیا جائے جو خدا کے خوف اور اور اسی کے نازل کردہ ضابطوں پر مبنی ہو اور جو انسانوں کے مفاد کی خدمت کرے (الجهاد فی الاسلام ص: ۱۱۷-۱۱۸ باختصار)۔

اس نظریہ کے خلاف تین طاقت ور دلائل:

(۱) اس نظریہ کے خلاف سب سے پہلے جو چیز جاتی ہے وہ یہ کہ اسلام کی ایک بنیادی تعلیم دین کے معاملے میں آزادی اور انصاف ہے۔ کسی قوم کو اپنی حکومت سے بے سبب محروم کرنا اور اس پر دوسری قوم کی حکومت قائم کرنا فطری طور پر انصاف کے خلاف نظر آتا ہے۔ اسلامی دعوت کے لئے ضروری ہے کہ اسلام اپنے زمانے میں سب سے برتر اور

متوازن اخلاقی معیار پر قائم نظر آئے۔ اگر ایسا نہیں ثابت ہوتا تو اسلام کا اکیلے محفوظ ہدایت ربانی اور قانون الہی ہونے کا دعویٰ مشتبہ ہو جائے گا۔ لہذا علماء اسلام کا اہم ترین فریضہ قرار پاتا ہے کہ وہ ہر زمانے میں پوری بیدار مغزی سے اپنے زمانے کے حالات کا جائزہ لیں اور بلا خوف و لومۃ لائم قرآن و سنت پر مبنی اسلامی قوانین کا اظہار کریں۔ اس میں ان کو نہ باطل کی یورش کا خوف ہو نہ کسی قسم کی بدنامی کا اور نہ انہوں یا غیروں کی ملامت کا۔

(۲) دوسری جو چیز اسی نظریہ کے خلاف جاتی ہے وہ یہ آیت قرآنی ہے: ﴿وَيَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا جُحُودًا لِلَّهِ فَاِجْتَنِبُوا هَٰؤُلَاءِ دُخُولَ دَعْوَىٰ مُشْرِكِيهِمْ وَتِلْكَ الْأُمُورُ حَرْثُ الشَّيْطَانِ لَا يَأْتِي بِبَرٍّ وَلَا كَرٍّ﴾ یعنی اگر یہ خدا اور مسلمانوں کے دشمن صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی صلح پر آمادہ ہو جانا۔

یہ آیت غزوہ بدر کے بعد نازل ہوئی۔ اس سے صلح کا کس درجہ مطلوب ہونا معلوم ہوتا ہے اس کے لیے صرف سادہ سامعین جان لینا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے سیاق و سباق پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کس درجہ اس کو اہمیت دیتا ہے کہ فریق مخالف اگر آمادہ صلح ہو تو صلح کر لی جاتی ہے۔ اس آیت میں غور سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا حکم مجبور و کمزور کی ذہنی کجی صلح کا نہیں ہے، نہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ صلح میں ہمارا فائدہ ہے کہ نہیں۔ یہ سورت انفال کی آیت ہے۔ اس سورت میں مسلمانوں کو مکہ کے مشرکین سے جنگ کے احکام دیے گئے اور ایک طویل سلسلہ آیات میں مسلمانوں کے اندر قتال کے لئے جوش و حمیت پیدا کی گئی ہے۔ یہی سلسلہ بیان جب اپنے عروج پر یہاں پر پہنچا کہ **وَاللَّهُمَّ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ:**

”اور ان دشمنانِ خدا کے مقابلے کے لئے جو ہو سکے وہ اسلحہ تیار کرو (اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرو۔) اور گھوڑے جنگ کے لئے تیار رکھو، جس سے تمہارا رب اللہ کے دشمن اور تمہارے دشمن کے دل میں بیٹھے۔“

اور اس کے بعد اس جہاد و قتال کی تیاری میں اپنا مال خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی۔ جہاد و قتال پر آمادہ کرتے ہوئے، اور جہاد و قتال کے لیے جوش دلانے والے اسی ولولہ خیز سلسلہ کلام میں ارشاد ہوتا ہے کہ: **وَأَنْ جُحُودًا لِلَّهِ فَاِجْتَنِبُوا هَٰؤُلَاءِ دُخُولَ دَعْوَىٰ مُشْرِكِيهِمْ وَتِلْكَ الْأُمُورُ حَرْثُ الشَّيْطَانِ لَا يَأْتِي بِبَرٍّ وَلَا كَرٍّ** (الانفال: ۶۱-۶۲) ”اگر یہ (خدا و مسلمانوں کے دشمن، اپنی دشمنی کے باوجود) مصالحت کی طرف جھکتے ہیں تو تم بھی اس کی طرف جھک جانا، اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ بے شک وہ (سب) سننے اور جاننے والا ہے۔ اگر ان کی نیت تم کو دھوکہ دینے کی ہوگی تو اللہ تمہارے لئے کافی ہے۔“

کلام کے سیاق و سباق پر غور کیجئے۔ یہ موقع مسلمانوں کو مشرکین مکہ کے خلاف جنگ پر آمادہ کرنے اور ان میں اس کی تیاری کے لئے جوش و حمیت پیدا کرنے کا ہے۔ پھر بھی کہا جاتا ہے کہ دشمن اگر صلح پر آمادہ ہوتا ہے تو صلح کرنے کا حکم ہے۔ کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ دشمن صلح کے بہانے دھوکہ نہ دے دے۔ سواس کی پیش بندی کے طور پر پہلے تو کہا کہ صلح کرنے میں تو کل علی اللہ کا مظاہرہ کرو۔ پھر مزید صراحت کی کہ اگر ان کے دھوکہ دینے کا اندیشہ ہو تو جان لو کہ اللہ یہ توکل ہی تمہارا سرمایہ ہے۔ یعنی اس سلسلہ میں اندیشہ نہ ہو اور ان کا آمادہ خیال نہ کرو۔

کیا یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے؟ سید قطب مرحوم نے بڑے شدد و کد کے ساتھ اس رائے کی تائید کی ہے کہ صلح کر لینے کا یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ ان حضرات کو جو اس آیت کو غیر منسوخ قرار دیتے ہیں سید قطب ان کو ”المہزومون روحیا وعقلیا“ (عقلی اور روحانی اعتبار سے شکست خوردہ) قرار دیتے ہیں، سادگی اور حماقت سے موصوف کرتے ہیں اور اسلام کے مزاج و منہاج سے بے خبر بتاتے ہیں۔

حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ اس آیت کو منسوخ قرار دینے کی کوئی دلیل نہیں ہے، مفسرین اور فقہاء کی ایک تعداد اگرچہ یہ کہتی ہے کہ سورہ توبہ کی یہ آیت اس کی ناسخ ہے۔

﴿فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحَرَامُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصِرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ﴾ (اور جب اشہر حرم گزر جائیں تو جہاں پاؤ ان مشرکین کو قتل کرو ان کو پکڑو، گھیرو، اور ہر جگہ ان کے (قتل کے لئے) گھات لگا کر بیٹھو)۔

یقیناً سورہ انفال کی وہ آیت جو دشمن کے آمادہ صلح ہونے پر صلح کا حکم دے رہی ہے وہ پہلے نازل ہوئی ہے اور سورہ توبہ کی آیت بعد میں، مگر جنگ کا حکم دینے والی سورت توبہ کی ان آیات کے سیاق و سباق پر ذرا غور کرنے سے قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ احکام مشرکین عرب (جو قریش کی قیادت میں ایک ملت اور سیاسی اتحاد کا درجہ رکھتے تھے) کے لئے نازل ہو رہے تھے۔ آپ اول سورت سے آیت نمبر ۲۸ تک پڑھ جائیے قطعی طور پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ سورت عرب کے مشرکین سے متعلق ہی گفتگو کر رہی ہے۔ یہ گفتگو جن مشرکین کے متعلق کی جارہی ہے دوران کلام ان کے جو حالات اور صفات بیان کی گئی ہیں اس سے کسی ذی شعور کے لئے شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ اس سلسلہ کلام میں صرف مشرکین عرب مراد ہیں۔ مثلاً کہیں کہا جا رہا ہے کہ ”جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا“ آیت نمبر (۱)، پھر آگے ان کی صفت یہ بھی آیت نمبر ۱۳ میں بتائی جا رہی ہے کہ:

أَلَا تَقَاتِلُونَ قَوْمًا نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُمْ بَدُّوْكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ

(کیا تم ان لوگوں سے جنگ نہیں کرو گے جنہوں نے عہد توڑ ڈالا، رسول کو بدر کرنے کا ارادہ کیا اور

انہوں نے ہی تمہارے خلاف جنگ چھیڑی ہے)۔

ظاہر ہے معاہدہ مشرکین عرب سے ہی ہوا تھا۔ المشرکین سے مراد مشرکین عرب ہی ہیں اس کو مزید مؤکد کرنے والی آیات آگے اور ہیں جن میں ان کے مسجد حرام (کعبہ) سے رشتہ کا ذکر کر کے کہا جا رہا ہے کہ اب ان سے اس کی تولیت چھینے جانے کا وقت آ گیا ہے (۱۷-۲۲)۔ پھر آیت نمبر (۳۶) نے تو کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ ارشاد

هُوَ الَّذِي يُقَاتِلُ الْكُفْرَ وَالْمُنَافِقِينَ وَالَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَإِذَا قَاتَلْتُمُوهُمْ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيْكُمْ

”تمام مشرکین سے جنگ کرو جیسا کہ وہ سب کے سب تم سے جنگ کر رہے ہیں۔“

سورت انفال میں پہلے انہی مشرکین کے بارے میں حکم دیا گیا تھا کہ ”اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل

ہو جانا، مگر قرآن خود بتا رہا ہے کہ اس حکم کی تبدیلی کا سبب ان کی لگا تار جارحیت، ظلم وعدوان، اور عہد شکنی کی تاریخ ہے، جیسا کہ ابھی ذکر کی گئی آیتوں میں صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ ان کے سینوں میں عداوت کی جہنم ہے، وہ کسی رشتہ و قرابت اور معاہدے تک کا لحاظ نہیں کر رہے لہذا اب بس، ان کو تیر تیغ کرو، یہاں قرآن ان کو بد عہدی اور ظلم و اعتداء کا مرتکب بھی بتا رہا ہے، ﴿لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلَّا وَاُولَئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُونَ﴾۔ لہذا یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کو ہر حال میں تیر تیغ کرنے کا حکم کا سبب ان کی بے اعتباری اور یہ اعتداء تھا۔

قرآن کی کسی آیت کو اس معنی میں منسوخ قرار دینا کہ وہ معطل کر دی گئی ہے اور اب اس پر عمل نہیں کیا جائے گا ایک بڑی بھاری بات ہے۔ اتنی پر خطر بات کہنے کے لئے کوئی یقینی بنیاد ہونی چاہئے، جو یہاں ہرگز نہیں ہے۔ صلح کا حکم دینے والی آیت بالکل الگ قسم کے حالات اور الگ دشمن کے لئے ہے اور سورہ توبہ کی آیات الگ صورت حال میں ایک متعین دشمن سے جنگ کرنے اور اس کے لئے زمین تنگ کر دینے کے حکم پر مشتمل ہے۔

صلح کا حکم قرآن نے اس صورت میں دیا ہے جب دشمن صلح جو ہو۔ کہا گیا اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی مائل بہ صلح ہو جانا اور اس پر یہ اضافہ کیا گیا کہ دشمن سے اگر عہد شکنی کا اندیشہ ہو تب بھی اللہ کے بھروسے پر صلح کر ہی لی جائے اور سورہ توبہ کی آیت جو دشمن سے بھرپور جنگ کرنے کا حکم دے رہی ہے وہ بتا رہی ہے کہ جن ”المشرکین“ کے بارے میں یہ حکم ہے وہ یہی نہیں کہ صلح جو نہیں بلکہ تم سے جنگ کر رہے ہیں اور ایسے عہد شکن ہیں کہ اب ان کی صلح پر آمادگی کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی سلسلہ آیات میں آگے کہا گیا: ﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَمَا يَفْقَاتُلُونَكُمْ كَافَّةً﴾ اور تمام مشرکین سے جنگ کرو جس طرح وہ سب کے سب تم سے جنگ کرتے ہیں۔

سورہ انفال کی یہ آیت (۶۱) دوسرے فریق کے صلح پر (یقیناً بامعنی اور منصفانہ صلح پر) راضی ہونے کی صورت میں اس کو نہ صرف قبول کرنے بلکہ کشادہ قلبی کے ساتھ قبول کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ اس لئے کہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اصلاً تو مفلکوں مسلمانوں کو آمادہ جنگ کرنے کی چل رہی تھی مگر پھر بھی مسلمانوں میں صلح پر آمادگی پیدا کرنے کے لئے یہاں تک ارشاد ہوا: وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وَإِنْ يَرِيدُوا أَنْ يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ هُوَ الَّذِي أَيْدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ

”اور (اس سلسلہ میں) اللہ پر بھروسے سے کام لو۔ وہ سب سننے جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ تم کو

دھوکہ دینا چاہیں گے تو اللہ کافی ہے تمہارے لئے۔ اسی نے تو اپنی مدد اور مؤمنین کی جماعت کے ذریعہ

تمہاری تائید کی ہے۔“

اس کی تشریح میں ابن کثیر کہتے ہیں کہ ”مطلب یہ ہے کہ اگر وہ صلح کر کے دھوکہ دینا چاہیں تاکہ اسی مدت میں

تیاریاں کر لیں تو جان لو کہ اللہ تمہارے لئے کافی ہے۔“

۳ پوری تفصیل نے یہ بات واضح کر دی کہ سورہ توبہ کی آیات صلح کی آیت کو منسوخ نہیں کہہ رہی ہیں۔ نسخ کی کوئی دلیل

نہیں ہے۔ دونوں آیات قطعی طور پر الگ حالات اور الگ دشمنوں سے متعلق ہیں۔ کوئی اگر خود قرآن میں غور کرے اور اگر اپنے ذہن میں قائم خیالات اور کسی مخصوص نظریے کے تاثرات سے آزاد ہو کر سوچے تو وہ اسی نتیجے تک پہنچے گا، اور کتاب اللہ کی آیات کو مصحف میں موجود ہوتے ہوئے اور تلاوت کرتے ہوئے بلا قطعی دلیل کے ہرگز یہ نہیں کہے گا کہ وہ منسوخ اور معطل ہیں۔ جیسا کہ امام طبری جو سرخیل مفسرین ہونے کے ساتھ ساتھ حدیث و فقہ میں بھی امامت کے مقام پر فائز تھے اس آیت کے منسوخ ہونے کی بات بالکل بے بنیاد قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: لا دلالة عليه من كتاب ولا سنة ولا فطرة ولا عقل۔ اس کی کتاب و سنت اور عقل و فطرت سے کوئی دلیل نہیں پیش کی جاسکتی۔

ہاں سورہ محمد کی ایک آیت میں کمزوری دکھاتے ہوئے دشمن سے صلح کی دہائی دینے کو منع کیا گیا ہے۔ لیکن یہ ایک بالکل دوسری بات ہے اور دشمن کے ساتھ باعزت صلح ایک دوسری چیز ہے۔

(۳) تیسری ایک بات اور ہے جو قطعی طور پر اس کا فیصلہ کر دیتی ہے کہ خود ہمارے فقہاء کے نزدیک غیر مسلم حکومت خود اپنی ذات میں ایسی چیز نہیں ہے جس کو برداشت ہی نہیں کیا جاسکتا اور مسلمانوں پر اس کو ختم کرنا دینی فریضہ ہے۔ فقہاء اس پر متفق ہیں کہ اگر غیر مسلم حکومت کی طرف سے کچھ مال دے کر صلح کی پیش کش کی جائے تو مسلمانوں کی حکومت کے لئے جائز ہے کہ وہ اس مال کو قبول کر کے غیر مسلم حکومت کو باقی رہنے دے اور صلح کر لے۔ فقہاء نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ یہ ”جزیہ“ والی صورت نہیں ہوگی بلکہ غیر مسلم حکومت اپنی پوری آزادیوں اور کفر کے قوانین کے نفاذ کے ساتھ باقی رہے گی۔

اب اگر مولانا مودودیؒ کی بات کو تسلیم کر لیا جائے تو بات یہ ہوگی کہ یوں تو اگرچہ ایک غیر مسلم حکومت سارے فتنہ و فساد کی جز اور خرابیوں کا منبع ہے اس لئے اس کو اکھاڑ پھینکا اور اس کی جگہ اہل حق کی حکومت قائم کرنا ضروری ہے، لیکن اگر مال ملے تو پھر سب قابل برداشت ہو سکتا ہے۔ ذرا غور فرمائیں! یہ تو کوئی اخلاقی پوزیشن نہیں ہوئی۔ اللہ کا دین یقیناً اس سے بری ہونا چاہئے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارے ائمہ اور فقہاء متقدمین کے موقف کی جو یہ توجیہ اور تشریح کی جاتی ہے کہ ”شوکت کفر علت قتال ہے“ یا یہ کہ غیر مسلم حکومت کا وجود فی نفسہ اس بات کا مکمل سبب ہے کہ اگر قدرت ہو تو اس کو ختم کرنے کے ہدف سے اس کے خلاف جنگ کی جائے اور مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے کہ اگر ممکن ہو تو وہ غیر مسلم حکومت کا خاتمہ ضرور کریں، یہ صحیح توجیہ نہیں ہے۔ فقہاء کا یہ متفقہ مسئلہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ان کے نزدیک نہ کفر قتال کا سبب ہے نہ نظام کفر نہ حکومت کفر، کیوں کہ وہ سب مال کے عوض غیر مسلم حکومت سے صلح کرنے کو جائز کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو غیر مسلم حکومت مال دینے پر اسی وقت راضی ہوگی جب مسلمانوں کی طاقت کا پلہ بھاری ہو، یعنی یہ بات بھی نہیں کہی جاسکتی کہ ہمارے فقہاء نے اس کی اجازت اسی صورت میں دی ہے جب مسلمان کمزور ہوں یا خود ان کی مصلحت کا تقاضہ ہو کہ جنگ سے بچا جائے۔

بعض قدیم علماء کی صراحتیں کہ جنگ کا سبب محاربہ ہے:

اگرچہ ہمارے قدیم فقہاء کے یہاں یہ تصور ناپید نہیں ہے کہ نفس کفر جنگ کا سبب نہیں ہو سکتا۔ جنگ کا سبب محاربہ یعنی جارحیت ہے۔ امام ابن تیمیہ کا تو اس مسئلے پر مستقل رسالہ ”قاعدة مختصرة في قتال الكفار ومهادنتهم“ بھی ہے۔ جس میں انہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جنگ صرف اسی سے کی جائے گی جو خود آمادہ پیکار ہو۔ (قاعدة مختصرة في قتال الكفار ص ۱۲۱)

بعض علماء اس رسالہ کی ابن تیمیہ کی طرف نسبت مشکوک قرار دیتے ہیں۔ مگر نیل الاوطار میں ایک جگہ شوکانی کے قلم سے اس رسالہ کا تذکرہ دیکھا تو اندازہ ہوا کہ شوکانی کے پاس غالباً اس کا نسخہ تھا۔ علامہ شوکانی نے لکھا ہے کہ وكون قتال الكفار لكفرهم هو مذهب طائفة من أهل العلم ، وذهب طائفة أخرى إلى أن قتالهم لدفع الضرر ... ومن القائلين بهذا شيخ الإسلام ابن تيمية وله في ذلك رسالة (نيل الأوطار)

(اور کفار سے قتال کا سبب ان کا کفر ہے، یہ بعض اہل علم کی رائے ہے، اور ایک دوسری جماعت کا موقف یہ ہے کہ قتال ان کے ضرر کو دفع کرنے کے لئے ہے... اس دوسری رائے کے حاملین میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ بھی ہیں اور ان کا اس موضوع پر ایک رسالہ بھی ہے۔)

اس رسالہ کا تذکرہ شوکانی سے پہلے علامہ امیر معانی کے یہاں بھی ملتا ہے، بلکہ انہوں نے اس کی تائید کرتے ہوئے اپنے ایک رسالہ میں اس کی تفسیر بھی کی ہے جو خاتر علماء الیمن نامی کتاب میں شائع ہو چکی ہے۔

ابن تیمیہ نے اپنی دوسری کتاب المنہات میں بھی اس رائے کو واضح الفاظ میں بیان کیا ہے، بلکہ اس کو جمہور علماء کا مسلک قرار دیا ہے، کہتے ہیں: الكفار إنما يقاتلون بشرط الحراب ، كما ذهب إليه جمهور العلماء ، وكما دل عليه الكتاب والسنة (النبوات ص: ۱۴۰)

(کفار سے جنگ اسی شرط پر کی جائے گی کہ وہ محاربہ کریں، جیسا کہ جمہور علماء کا مسلک ہے اور اسی پر کتاب وسنت کی دلیل قائم ہے۔)

ابن تیمیہ اور شوکانی کی ان عبارتوں سے یہ قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں حضرات کے نزدیک ماضی میں بھی اہل علم کی ایک تعداد اسی کی قائل رہی ہے کہ قتال صرف ظلم و جارحیت کے خلاف ہی کیا جاسکتا ہے اور اس کی اصل علت محاربہ (یا فتنہ وغیرہ) ہی ہے۔ ابن تیمیہ اپنی کتاب الصارم المسلول میں آیت کریمہ: ”اور اللہ کے راستہ میں قتال کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں، اور زیادتی مت کرنا، اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا“۔ (البقرة: ۱۹۹) کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں:

فأمر بقتال الذين يقاتلون ، فعلم أن شرط القتال كون المقاتل مقاتل . (الصارم المسلول: ۲۸۲) ”اللہ نے جنگ کرنے والوں سے قتال کرنے کا حکم دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قتال کے لئے یہ شرط ہے کہ جس کے خلاف جنگ چھیڑی جائے وہ جنگ کر رہا ہو۔“

• ابن قیمؒ اپنی کتاب ہدایۃ الحیاری میں کہتے ہیں:

إنما كان (صلى الله عليه وسلم) يقاتل من يحاربه ، وأما من سالمه وهاذنه فلم يقاتله (هداية الحيارى: ۱۲۱)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف اسی سے جنگ کرتے تھے جو خود جنگ کرتا تھا۔ جو صلح کرتا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے جنگ نہیں کرتے تھے)۔

اس موقف کا اظہار ہمیں طبری کے یہاں بھی ملتا ہے جنہوں نے اسی آیت صلح کی تفسیر کرتے ہوئے پہلے تو یہ غیر معمولی بات لکھی کہ: وان مالوا الى المسالمتك ومات كسك الحرب، اما بالدخول في الاسلام واما باعطاء الجزية واما بموادعة ونحو ذلك من اسباب السلام والصلح فاجتنب لها، يقول فعل اليها وابدل لهم ما مالوا اليه من ذلك وسالوك.

یعنی اگر وہ (دشمن) تمہارے ساتھ صلح اور جنگ بندی پر آمادہ ہو جائے چاہے اسلام قبول کرے یا جزیہ دے کر یا صلح کر کے، چاہے وہ کسی قسم کی اور کسی انداز کی بھی صلح ہو تو تم بھی صلح پسندی کا ثبوت دینا، اور وہ جو چاہیں وہ کر دینا اور دے دینا۔

پھر آیت کی اس اجمالی وضاحت کے بعد قادیان اور بعض دیگر حضرات کے اس قول پر کہ یہ آیت منسوخ ہے اور اس کی بعد میں اجازت نہیں رہی، وہ تبصرہ کرتے ہیں جو پیچھے گزر چکا کہ: اس کی کتاب وسنت اور عقل وفطرت سے کوئی دلیل نہیں پیش کی جاسکتی۔

دلائل پر ایک نظر:

جو حضرات اس کے قائل ہیں کہ مسلمانوں کو بشرط قدرت ساری غیر مسلم حکومتوں سے جنگ کرنے کا حکم ہے، ان سے بھی جو محاربہ یا ظلم کے مرتکب ہوں اور ان سے بھی جو کسی قسم کے محاربہ کے مرتکب نہ ہوں، ان حضرات کے اہم دلائل حسب ذیل ہیں: (۱) وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين لله (البقرة: ۱۹۳)۔

(اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ ”فتنہ“ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے۔)

اس آیت میں قتال کا جو دوسرا مقصد ”اور دین اللہ کیلئے خالص ہو جائے“ بتایا گیا ہے، اس میں بعض مفسرین نے

”دین“ کے معنی اطاعت کے بیان کیے ہیں (طبری)۔ یہیں سے یہ حضرات یہ استدلال کرتے ہیں کہ آیت مسلمانوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ تاحد مقدور اسلام کی حکومت کے قیام کیلئے قتال کریں، تاکہ قانون صرف اسلام کا باقی رہے۔
مولانا مودودیؒ اس استدلال کا مساحت یوں کرتے ہیں:

”اس مقام پر ”فتنہ“ سے مراد وہ حالت ہے جس میں دین اللہ کے بجائے کسی اور کے لئے ہو، اور لڑائی کا مقصد یہ ہے کہ یہ ”فتنہ“ ختم ہو جائے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو۔ پھر جب ہم لفظ ”دین“ کی تحقیق کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں دین کے معنی ”اطاعت“ کے ہیں، اور اصطلاحاً اس سے مراد وہ نظام زندگی ہے جو کسی کو بالاتر مان کر اس کے احکام و قوانین کی پیروی میں اختیار کیا جائے۔ پس دین کی اس تشریح سے یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے کہ سوسائٹی کی وہ حالت جس میں بندوں پر بندوں کی خدائی و فرماں روائی قائم ہو، اور جس میں اللہ کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن نہ رہے، فتنے کی حالت ہے، اور اسلامی جہاد کا مطمح نظر یہ ہے کہ اس فتنے کی جگہ ایسی حالت قائم ہو، جس میں بندے صرف قانون الہی کے مطیع بن کر رہیں۔“ (تفہیم القرآن ۱/۱۵۱)

مولانا کی اس تشریح کا حاصل یہ ہے کہ ”فتنہ“ یہ ہے کہ اللہ کے قانون کے علاوہ کوئی دوسرا قانون نافذ ہو۔ اور ”دین کل کا کل صرف اللہ کے لیے ہو جائے“ کا مطلب یہ ہے کہ ”بندے صرف قانون الہی کے مطیع بن کر رہیں۔“ اقتباس کے خط کشیدہ الفاظ پر دوبارہ غور کریں تو یہ استدلال کمزور نظر آئے گا۔ اس لیے کہ چاہے دین اپنے اصطلاحی معنوں میں ہو یا آیت کے معنی یہ ہوں کہ اطاعت خالصہ اور کل کی کل اللہ کی ہو جائے، اس سے یہ مراد لینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے؟ مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے اور اسلامی احکام کا قانونی نفاذ ہو بھی جائے تو بھی کفار اپنے شرک و کفر اور اللہ کی نافرمانی اور غیر اللہ کی اطاعت و بندگی پر قائم رہیں گے، ان کے احبار و رہبان ان کے لیے ناحق حلال و حرام کے فتوے دیتے رہیں گے اور اسلامی حکومت ان کے بہت سے معاصی و منکرات کا خاتمہ نہیں کرے گی۔ پھر اس آیت سے استدلال کے کیا معنی؟ مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے اور اسلامی قانون کے نفاذ اور جزیہ کی تحصیل کے بعد بھی نہ دین اپنے معروف معنی میں اللہ کے لئے خالص ہوتا ہے اور نہ اطاعت، مشرکین کا شرک اور یہود و نصاریٰ کی اطاعت رہبان و احبار بھی باقی رہے گی اور کفار کے معاصی بھی، کوئی جہاد دنیا میں دین یا اطاعت کو اللہ کے لئے خالص نہیں کرتا، پھر کیسے کہا جاسکتا ہے کہ جنگ کی غایت ”دین کا یا اطاعت کا اللہ کے لئے خالص ہو جانا“ ہے۔ جہاد کے نتیجے میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوگی تب بھی دین اللہ کے لئے خالص نہیں ہوگا نہ اطاعت اللہ کے لئے خالص ہوگی۔ یعنی نہ دین اللہ کے لیے خالص ہوگا اور نہ اطاعت۔

سادہ سے لفظوں میں آپ اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ جہاد کے نتیجے میں جو اسلامی حکومت قائم ہوگی وہ زمین پر کفر

کو بھی باقی رہنے دے گی اور (غیر مسلموں کے ذریعے) اللہ کی نافرمانیوں اور گناہوں کو بھی۔ لہذا جنگ کا ہدف دین یا اطاعت کا اللہ کے لیے خالص ہو جانا نہیں قرار دیا جاسکتا۔

بعض محترم علماء نے اس آیت میں دین کے معنی قہر و غلبہ کیلئے ہیں، جو یقیناً غلط فہمی ہے، ہم بعد ادب وضاحت کرتے ہیں کہ دین کے معنی عربی زبان میں قانون، اطاعت بدلہ وغیرہ کے تو آسکتے ہیں، قہر و غلبہ اور حکومت کے نہیں آتے۔

پھر آیت کا مطلب کیا ہے؟؟ اس مشکل کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ اس حقیقت واقعہ کو تسلیم کر لیا جائے کہ: دراصل یہ آیت صرف مشرکین عرب کے سلسلہ کا حکم بیان کر رہی ہے۔ آپ ذرا اس کے سیاق پر غور کیجئے۔

﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ تَا اِلَا عَلَى الظَّالِمِينَ﴾ (البقرة : ۱۹۰-۱۹۳)

(اور اللہ کے راستے میں ان سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کر رہے ہیں۔ اور زیادتی مت کرنا اللہ زیادتی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔ اور ان کو قتل کرو جہاں پاؤ، اور وہاں سے ان کو نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے۔ اور ”فتنہ“ قتل سے سنگین تر ہے، اور ان سے مسجد حرام کے پاس جنگ مت کرنا جب تک وہ وہاں تم سے جنگ نہ کریں، اگر وہ مسجد حرام میں تم سے جنگ کریں تو تم ان کو قتل کرو۔ کافروں کا یہی بدلہ ہے۔ تو اگر وہ باز آجائیں (شرک سے) تو اللہ غفور درحیم ہے۔ اور ان سے جنگ کرو اس وقت تک جب تک کہ فتنہ نہ ختم ہو جائے اور دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے۔ اگر وہ باز آجائیں (جنگ) سے تو کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی سوائے ظالموں کے (کسی پر)۔

آیات کا سیاق قطعی طور پر ان مشرکین مکہ کے ساتھ خاص ہے جنہوں نے اسلام کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی تھی، جن کے خلاف مسلمانوں میں جوشِ حیت پیدا کرنے کے لئے قرآن نے کہا تھا ﴿وَهُمْ بِدُؤِكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾: (انہوں نے ہی لڑائی کی ابتدا کی تھی)۔ ان مشرکین کے سلسلے میں یہ سلسلہ آیات شروع ہی یہاں سے ہوا ہے کہ: ”اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں“۔ اس سلسلہ بیان میں حکم دیا گیا ہے کہ ان مشرکین سے تم کو جنگ شروع کرنے کا جو حکم دیا جا رہا ہے اس کی عملی غایت اور انتہا یہ ہے کہ ان کا فتنہ ختم ہو جائے اور دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے۔ اس سیاق و پس منظر میں دین کے اللہ کے لئے اصل ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ مشرکین جس علاقے یعنی جزیرہ عرب کے باسی ہیں اس کے بارے میں یہ طے ہے کہ یہاں دین صرف اللہ کا ہی رہے گا۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض و فوات میں وصیت فرمائی کہ: ”مشرکین کو جزیرہ عرب سے نکال دیا جائے۔“ (صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب جواز الوفاء) اور یہی عمل ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور ارشاد: ”اَمْرُتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ“۔ مجھے لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ اس معنی کو حتمی طور پر طے کرنے والی بات ہے کہ متفقہ طور پر لوگوں سے زبردستی اسلام قبول

کروانا جنگ کی غایت ہرگز نہیں ہے۔ اگر اس حدیث کو (مذکورہ بالا آیت کی طرح) جزیرۃ العرب کے ساتھ خاص نہ مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مجھے لوگوں سے جنگ کرنے اور قتل و قتل کرنے کا حکم ہے الایہ کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ تقریباً یہی الفاظ سورۃ انفال آیت ۳۹ میں بھی آئے ہیں، وہاں بھی سیاق و سباق یقینی طور پر مشرکین مکہ کو متعین کرنے والا ہے (۳۲) اس موقف کے اہم دلائل میں سورۃ توبہ کی دو آیتیں بھی ہیں: قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الآخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الكتاب حتی یعطوا الجزیة عن ید وہم صاغرون۔ (آیت: ۲۹)

(جنگ کرو ان لوگوں سے جو ایمان نہیں رکھتے اللہ پر اور نہ آخرت کے دن پر اور دین حق کی اتباع نہیں کرتے، یعنی اہل کتاب سے، یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں ہاتھ سے اور تابع بن کر رہیں۔)

دوسری آیت اسی سورت کی یہ آیت ہے:

یا ایہا الذین آمنوا قاتلوا الذین یلونکم من الکفار ولیجدوا فیکم غلظة۔ (آیت: ۱۲۳)

(اے ایمان والو! اپنے پاس کے کفار سے جنگ کرو، اور چاہئے کہ وہ تم میں سختی پائیں)۔

ان دونوں آیتوں سے استدلال اس طور پر ہے کہ پہلی آیت میں قتال کے حکم کے ساتھ اس حکم کی غایت یہ بتادی گئی کہ یہ اہل کتاب کفار مسلمانوں کے تابع ہو کر جزیہ دینے پر راضی ہو جائیں، تاکہ ان کی بالادستی اور خود مختاری ختم ہو جائے، وہ زمین میں صاحبِ ارادہ حاکم بن کر نہ رہیں، بلکہ زمین کے نظام زندگی کی باگیں اور امامت و فرماں روائی کے اختیارات دین حق کی اتباع کرنے والوں کے ہاتھوں میں آجائیں۔ دوسری آیت بھی مطلقاً کفار سے جنگ کرنے کا حکم دیتی ہے، اور اس میں کہیں اس کا اشارہ بھی نہیں ہے کہ وہ دعوت حق کا راستہ روکیں، یا اللہ کے بندوں پر ظلم کریں یا مسلم حکومت کے خلاف جارحیت کے مرتکب ہوں۔

دراصل ان آیتوں کا مدعا اور ان میں دیے گئے حکم کی اصل نوعیت سمجھنے کے لئے ان کے پس منظر اور ان حالات کو جاننا ضروری ہے جن کے درمیان وہ نازل ہوئیں۔ یہ آیات غزوۂ تبوک کے موقع پر نازل ہوئی ہیں۔ یہ بیزنطینی روم کے خلاف ایک مهم تھی جو نوبہجری میں انجام دی گئی، اس وقت ہرقل عظیم رومن سلطنت کے فرماں روائے اعظم قیصر کی حیثیت سے سربراہ سلطنت ہو چکا تھا، اور اسی لئے اسلامی مآخذ اس کو کبھی قیصر اور کبھی ہرقل کہتے ہیں۔ رومن حکومت کی کچھ عمل داریاں عرب سرزمین میں حدود شام اور شام کے اندر قائم تھیں۔ شمال عرب میں غسانیوں کی مشہور حکومت تو مستقل طور پر ان کی تابع تھی ہی، اس کے علاوہ اسی علاقہ کی کچھ دیگر قبائلی طاقتیں بھی رومیوں کی عمل داری میں تھیں اور عیسائی ہو چکی تھیں، گویا یہ پورا خطہ رومی سلطنت عظمیٰ کا حصہ تھا۔

رومی سلطنت سے کشش کا آغاز ۶۳۷ء میں ہوا، پہلے یمن کا تھا، پھر شام، عراق، مصر، ایران، ہند جاہر طاقت، کو جس نے

جاگیرداری کے ظالم نظام میں غریب عوام کو جکڑ رکھا تھا، اپنے بالکل پڑوس میں ایک ایسی ابھرتی ہوئی طاقت کیسے برداشت ہو سکتی تھی جو اپنے جلو میں دلوں کو فتح کرنے والی ایک ایسی دعوت رکھتی تھی جس کا اعلان تھا: ”پادشاہوں کی نہیں، اللہ ہے یہ زمین“ اور ”اللہ کی بندگی میں داخلہ، بندوں کی غلامی سے آزادی“۔ ابتداء ایسے ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۵ آدمیوں کی ایک جماعت ان علاقوں میں بھیجی انہوں نے وہاں دعوت اسلام دی، مگر ان سب کو ذات اطلاع نامی مقام پر قتل کر دیا گیا۔ ان کے امیر حضرت کعب بن عیر نہایت زخمی حالت میں بچ کر مدینہ واپس آئے اور اس سنگین واقعہ کی اطلاع دی۔ (سیرت ابن اسحاق، البدایہ والنہایہ)

ابھی یہ زخم تازہ ہی تھا کہ رومی حکومت کی ایک اور جارحیت اور اسلام دشمن حرکت سامنے آئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شمال کے ان عرب علاقوں میں مستقل دعوتی مہمیں بھیجی تھیں۔ ان کے نتیجہ میں فروہ بن عمرو (یا ابن نفاش) نامی ایک عرب حاکم نے جو رومیوں کی جانب سے عرب قبائل پر متعین تھا اسلام قبول کر لیا اور رسول اللہ ﷺ کو خیر رسالی کے طور پر کچھ ہدایا بھی بھیجے۔ رومیوں نے اس کو مرکز طلب کیا اور قتل کر کے سوئی پر چڑھا دیا۔ (سیرت ابن ہشام)

اسی زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمانروایان ممالک کو دعوت اسلام کے خطوط بھیجے تھے، ان میں ایک خط بصری کے حاکم کے نام بھی تھا۔ راستے میں غسانی بادشاہ شریحیل بن عمرو نے، جو رومی حکومت کا علاقے میں نائب تھا اور عیسائی تھا، آپ کے سفیر حضرت حارث بن عیر کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے یہ پورا خطہ رومی سلطنت میں داخل اور عیسائی حکومتوں کے تابع تھا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ان طاقتوں کی تادیب ضروری سمجھی۔

اب غزوہ موتہ ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا غالباً اندازہ تھا کہ روم کی تابع ان عرب ریاستوں کے لئے ایک مختصر فوج (۳ ہزار) کافی ہونی چاہئے۔ مگر ادھر براہ راست قیصر (ہرقل) حرکت میں آچکا تھا۔ اسلامی لشکر علاقے میں پہنچا تو پتہ چلا کہ رومی زبردست لشکر کشی کرنے کی تیاری کر چکے ہیں، غسانی عیسائی عرب قبائل کی بڑی تعداد لے کر سامنے ہیں اور ایک بڑی کمک لے کر ہرقل کا بھائی تھیوڈور آ رہا ہے۔ خود قیصر روم حص میں پڑاؤ ڈالے ہے۔ بہر حال اللہ کی نصرت اور مجاہدین کی جانبازیوں کی بدولت لشکر اسلام بحفاظت واپس آگیا، ارومی مرعوب ہوئے اور ان کو اندرون عرب لشکر کشی کی جرأت نہیں ہوئی۔

اس اثناء میں خود مدینے کے اندر سے ایک فتنہ شخص ابو عمرو راہب عیسائی ہو کر غسانیوں کے یہاں بھاگ گیا تھا، اور مستقل اس سازش میں معروف تھا کہ وہاں سے ایک بڑی فوج لے کر مدینہ پر حملہ کرے، مدینہ میں منافقین مستقل اسی کے رابطے میں تھے، آخر جب یہ سازش اپنے عروج کو پہنچی تو انہوں نے عین مدینہ میں مسجد کے نام پر اپنا ایک مستقل مرکز بھی بنالیا جہاں بیرونی حملہ آور افواج کی مدد کے منصوبے تیار ہوتے تھے۔ قرآن نے اسی پوری سازش کا پردہ چاک کیا کہ یہ مرکز دراصل رومی حملہ کی سازشوں کا گڑھ ہے۔ (سورہ توبہ: ۱۰۷)

اب سن ۹ ہجری آتا ہے۔ رومیوں کی حرکتیں اس درجہ بڑھ گئی تھیں کہ صحابہ کرام کو مجرم رومی حملے کا اندیشہ لاحق تھا۔ ایلاء

کے سلسلہ واقعات میں آتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے ایک پڑوسی نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا اور نہایت بے چینی کیساتھ کہا کہ: ارے! بڑا حادثہ ہو گیا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دفعتاً پوچھا: کیا ہوا؟ کیا غسانوں نے حملہ کر دیا؟ خود حضرت عمر بیان کرتے ہیں کہ اس زمانے میں یہ خبریں آ رہی تھیں کہ غسانی حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں (صحیح بخاری)۔

اب تاجروں اور مسافروں نے آ آ کر خبریں دیں کہ رومی اپنے حلیف عیسائی عرب قبائل اور ریاستوں کیساتھ مل کر مدینہ پر حملہ کرنے کیلئے تیاریاں کر رہے ہیں، فوجوں کو ایک سال کی تنخواہیں پیشگی بائی گئی ہیں، اور کچھ دستے بلتا تک پہنچ رہے ہیں۔ (المواہب اللدنیہ (مع شرح زرقانی) ۶۳/۳، ابن سعد ۲/۱۶۵)۔ روایات بتاتی ہیں کہ عیسائی قبائل نے اپنے آقا قیصر روم کو خط لکھ کر یہ خبر دی کہ عرب میں اس سال شدید قحط ہے، حملہ کرنے کے لئے یہ موقع اچھا ہے تو اس نے اپنی طرف سے ایک بڑی فوج تیار کر کے عرب پر لشکر کشی کے لیے بھیجی۔ (المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۳۱/۱۸)۔

یہ وہ حالات تھے جن میں رسول اللہ ﷺ نے غزوہ تبوک کا فوری حکم دیا اور باوجود اس کے کہ موسم سخت گرم تھا اور مسلمانوں کو سخت غربت اور تنگ حالی کا سامنا تھا، لہذا جنگ کیلئے یہ وقت نہایت مشکل اور نامناسب تھا۔ لیکن کوئی تاخیر اس لئے ممکن نہیں تھی کہ خطرہ نہایت سنگین تھا اور فوری تھا۔ خطرہ اس لیے بھی نہایت سنگین تھا کہ فتح مکہ کے بعد عرب قبائل کا اسلام ایسا مضبوط نہیں ہوا تھا کہ اگر رومی اندرون عرب گھس کر حملہ کرتے تو ان سے استقامت کی امید کی جاتی۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے فوراً بعد ان قبائل کی بڑی تعداد کے ارتداد اور بغاوت نے ثابت کر دیا کہ اگر روم جیسی طاقت کا حملہ ہوتا تو یہ قبائل یقیناً بغاوت کر دیتے اور اسلامی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے۔ اس لئے آپ ﷺ نے مرحہ پر جا کر ہی دشمن کو روکنا اور مسلمانوں کی قوت کا عرب قائم کرنا ہر حال میں ناگزیر جانا۔

ان حالات میں یہ دونوں آیتیں مسلمانوں کو رومی طاقتوں سے جنگ کیلئے حکم دینے اور اس پر ابھارنے کیلئے نازل ہوئیں ایک اہم نکتہ جس پر ان آیات کا صحیح فہم موقوف ہے: اس دراز تفصیل کی ضرورت اس لئے

ہوئی کہ یہ واضح کیا جاسکے کہ یہ آیات دراصل اہل کتاب سے جنگ کے فقہی مسئلہ کو بیان کرنے یا ابتداء اس کا حکم دینے کے لئے نازل نہیں ہوئیں، اہل کتاب سے اور رومی عیسائی طاقتوں سے کشمکش پہلے سے جاری تھی۔ یہ جنگ پہلے سے فرض ہو چکی تھی اب یہ آیات مسلمانوں میں اس جنگ کیلئے ہمت و جوش پیدا کرنے کے لئے نازل ہوئی ہیں اور رومیوں کی یہ صفات کہ وہ اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے دین حق کے منکر ہیں، اور اللہ و رسول کے محرمات کو حرام نہیں سمجھتے، فوجوں کے اندر جوش اور ان کے خلاف غیظ و غضب پیدا کرنے کے لئے بیان کی گئی ہیں۔ یہ رومیوں سے قتال کی علت نہیں ہیں۔ قتال کی علت رومیوں کا صد عن سبیل اللہ (اللہ کے راستے سے روکنا) ایک مسلمان کو اسلام قبول کرنے کی پاداش میں قتل کرنا (قتل) اور مسلمانوں پر حملہ کرنے کی تیاریاں (محاربہ) کرنا تھا۔ بہر حال اس سے پتہ چلتا ہے کہ

شمال عرب کی ان ساری مہموں کی اصل علت ”محاربہ“ اور ”قتل“ تھی (بقیہ صفحہ نمبر ۵۶ پر)